

ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر

شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

رشید اختر ندوی کے اردو ناولوں میں ترقی پسند رجحانات کا توضیحی مطالعہ

The progressive movement (taraqqi pasand tehreek) which commenced from the end of the third decade of the twentieth century is considered important due to its highly diverse effects. This movement had a deep influence on the literature of its time. Rasheed Akhtar Nadvi is a romantic novelist who emerged during the fourth decade of the twentieth century. He wrote sixteen romantic novels. All of these novels became popular as they were well suited to that time's trends. In this study, the author has analyzed the progressive approach and has displayed in his novels. In his novels, his interest in the communist and progressive literary styles is highly visible. His novel 'Tashnagi' Is a good example of this observation. Rasheed Akhtar Nadvi, in this novel, has focused on the unsuccessful dreams of the communist community.

رشید اختر ندوی کی اردو رومانی ناول نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے عمومی مزاج اور خود اپنے رجحان طبع کے زیر اثر رشید اختر ندوی کے جملہ رومانی ناولوں میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اشتراکی رجحانات بھی دکھائی دے جاتے ہیں، لیکن بعد کو اسلامی تاریخ نویس کے طور پر رشید اختر ندوی کی جو شہرت مستحکم ہوئی اس کی وجہ سے اور دیگر متعدد وجوہ کی بنا پر رشید اختر ندوی کے اردو رومانی ناولوں پر نقادان ادب نے وہ توجہ نہیں دی، جو دی جانی چاہیے تھی۔

رشید اختر ندوی کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اگرچہ سہیل بخاری کا رویہ خاصا جارحانہ ہے لیکن پھر بھی ان کے اندازِ تحریر سے رشید اختر ندوی کی انفرادیت کے بعض پہلو آشکار ہو ہی جاتے ہیں۔ وہ انہیں بسیار نویس کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑے ناول نگار کی قابل تعریف خوبی شمار کی جانی چاہیے۔ وہ رشید اختر ندوی کے ناولوں کی دو قسموں یعنی عشقیہ اور تاریخی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عشقیہ سے مراد غالباً معاشرتی رومانی ناول ہیں تو جن کا اس دور میں کافی چلن تھا۔ ایک اعتراض رشید اختر ندوی کی ناول نگاری پر تھکا دینے والی یکسانیت کا بھی ہے۔ (1) مراد یہ ہے کہ، رشید اختر ندوی کے بیشتر رومانی ناول جیسا کہ ساز شکستہ، سوز دروں، سودائی، نسرین، تلخیاں، ہرجائی، ایک پہیلی، کانٹوں کی سیج اور اس نے محبت کی، یکساں سماجی ماحول اور اخلاقی سطح لئے ہوئے ہیں اور جملہ ناول اپنی تکنیک، پلاٹ اور تسلسل سمیت ناول کے مرکزی کرداروں کے گرد گھومتے ہیں اور یہ گردش بعض اوقات اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ اپنا محور تک تبدیل کر لیتی ہے، تو یہ بات بہت زیادہ قابل تردید نظر نہیں آتی۔ یہ سارے ناول قریباً دس سال کے عرصے میں سامنے آتے ہیں ان دس سالوں میں

منظر، ماحول اور انسانی عمل و ردِ عمل میں کسی قدر تغیر رونما ہوا ہوگا؟ اس کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

یکسانیت سے مراد بعض دیگر امور بھی ہیں۔ مثلاً رشید اختر ندوی کے قریباً تمام ناولوں کا ہیرو متوسط طبقے کا محروم آرزو نوجوان ہوتا ہے اور کسی نہ کسی طرح نوجیز، منہ زور اور بعض صورتوں میں فیاض لڑکیوں کا ایک جھرمٹ اس کے ارد گرد رہتا ہے۔ ہاں ایک اور بات یہ کہ عمومی طور پر یہ تمام لڑکیاں بالیاں اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بات بھی ان ناولوں میں عمومیت کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے کہ ہیرو واضح طور پر نہیں جان پاتا کہ دراصل وہ کس بلا پر زیادہ فریفتہ ہے اور کیوں؟ اور اگر یہ ادراک ہو ہی جائے تو پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ اس پسندیدگی کی اطلاع موصوفہ کو نہ ہونے پائے۔ اسے طریقہ واردات تو نہیں کہا جاسکتا، ہاں مگر اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ رشید اختر ندوی کا ہیرو ناکامی اور ناتمامی میں اپنی طاقت اور سرخ روئی تلاش کرتا ہے۔ وہ روتا بھی ہے، پیتا بھی ہے، بیمار بھی ہو جاتا ہے، غرض اسے ہر وہ کیفیت عزیز ہے جو آس پاس کی لڑکیوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کا باعث بنے۔ یہ ساری صورتیں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کی رومانی ناول نگاری کا خاص رجحان خیال کی جاسکتی ہیں اور کچھ اکیلے رشید اختر ندوی کے رومانی ناولوں کو ہی اس کا ذمہ دار قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اُس دور میں اس طرح کے ناول پڑھنے والوں کا اپنا ایک حلقہ تھا اور ناول نگار قاری کی پسند ناپسند اور رجحان طبع کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک نفسیاتی وجہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ برصغیر میں یہ دور فیصلہ کن تبدیلیوں کی طرف گامزن ہے۔ انگریز کی غلامی کا احساس شدید تر ہے، آزادی کی تحریکیں تبدیلی اور اصلاح کے مشورے اپنی معاشرتی ترتیب، جدید تعلیم کے اثرات اور معاشرتی تقسیم در تقسیم کے عمل کے فائدے اور نقصانات سب اس دور کے ”فرد“ کو متاثر کر رہے تھے عامۃ الناس کی اکثریت ایسی تحریکوں کا معروضی تجزیہ کرنے اور اپنا ردِ عمل طے کرنے کے قابل، عمومی طور پر نہیں ہوتی، ایسے میں محروم آرزو کردار کہ جن کی اصل طاقت ہی ان کی نامرادی ہو، سامنے آتے ہیں۔ اس دور کے رومانی ناولوں کا ہیرو خواب اور حقیقت کی دنیا کی کشش کا اسیر ہے۔ رشید اختر ندوی اپنے شخصی تجربات، مشاہدات اور واردات کو اپنے ہیرو کے حوالے سے، خواب اور خیال کے رنگ میں رنگ کر پیش کرتے ہیں۔ ہر چند وہ ذاتی تجربے اور مشاہدے پر کثرت سے انحصار کرتے ہیں لیکن اپنے ”ہیرو“ کے کردار کے ارتقاء پر وہ بوجہ توجہ نہیں دے پاتے۔ وہ جیسا کہ شروع میں ہوتا ہے، ناول کے آخر تک وہ ویسا ہی رہتا ہے۔ گویا اس پر سب کچھ بیت جاتا ہے لیکن وہ اس پتہ سے تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ جذبات و خیالات سے بھرپور ہے، اسے شروع ہی سے اپنی اہمیت کا احساس ہے لیکن وہ قدرے شرمیلا، بعض مقامات پر احمق، اور بسا اوقات کامیابی پر ناکامی کو ترجیح دینے والا بن جاتا ہے۔

رشید اختر ندوی نے جس دور میں ناول نگاری کا آغاز کیا یعنی بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز میں، وہ دور برِ صغیر کی ادبی زندگی کا نہایت متغیر اور منہ زور اور ہنگامہ خیز دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ادبی رجحانات کے حوالے سے ”جہانِ پیر“ کی موت کے بعد ”جہانِ نو“ اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

”..... 20 سے 30 تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور پر کچھ عجب طرح کی بے فکری

آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا، جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم

میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کی بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اولاً حسرت

موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی، افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا..... لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانٹے تیس مار خان تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھاکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں۔ (2)

وقت کی سب سے بڑی خوبی حرکت کو قرار دیا جاتا ہے۔ جس دور اور جن رجحانات کا ذکر فیض احمد فیض نے کیا وہ جوں کے توں نہیں رہے۔ یہ دور، فیض احمد فیض اور رشید انور ندوی دونوں کی طالب علمی کا دور ہے یقینی طور پر جس ذہنی فضا میں انہوں نے جینے کی تربیت حاصل کی وہ اسی قسم کی ہوگی۔ لیکن اجتماعی فضا کے اس جس میں سے نئے امکانات بھی پیدا ہو رہے تھے۔ اس عہد کے نوجوان کے لئے ان گنت مصائب تھے، اور سب سے بڑا مسئلہ راہِ عمل کا تھا۔ یہی فضا نئے خیالات، تازہ رجحانات اور ارفع تخلیقات کے لئے راہ ہموار کرتی ہے اس سے متصل عہد کا نقشہ سجاد ظہیر نے یوں کھینچا ہے:

”1936ء سے لے کر 1939ء تک کا زمانہ (جب دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا) ہمارے ملک میں نئے خیالات، انقلابی تحریکیں، بلند عزائم اور جھلملاتی ہوئی امیدوں کا زمانہ تھا۔ یوں تو سامراجی محکومی کے دور میں کوئی بھی وقت ایسا نہیں آیا جب ہماری قوم کے دل سے آزادی کی لگن مٹی ہو۔ بغاوت بار بار ہوتی رہی، بے اطمینانی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی، بیرونی تسلط کے خلاف نفرت اور غصے کا مختلف طریقوں سے اظہار ہوتا رہا، بیرونی حکمرانوں کا ساتھ دینے والے اور ان کے ساتھ مل کر خود اپنی قوم پر سختی اور ظلم کرنے والے حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ انگریز حاکموں کی وضع قطع اور طرز زندگی کی نقالی کرنے والوں کو عام لوگوں نے کبھی پناہ نہیں دی اور ان کو ہمیشہ تمسخر اور ذلت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ہمارے ادب میں سو ڈیڑھ سو سال سے ان قومی جذبات اور تاثرات کا برابر اظہار ہوا لیکن زیرِ نظر دور کی بیداری کی چند نمایاں خصوصیات تھیں۔ اب جب قومی آزادی کا تذکرہ ہوتا تھا تو ملک میں ایک بڑا گروہ قوم، مزدوروں، کسانوں اور درمیانے طبقے کے معمولی لوگوں کو سمجھتا تھا۔ آزادی کے یہ معنی بتائے جانے لگے کہ بیرونی سامراجی اقتدار اور استحصال سے نجات حاصل کر کے ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جائے جس میں حکمرانی محنت کش کے ہاتھ میں ہو، ان کی لوٹ ختم کی جائے اور ذرائع و وسائل پیداوار ان کے قابو میں ہوں تاکہ تعاون اور اشتراک کی بناء پر دولت کی پیداوار ہو اور انصاف کے اصولوں پر اس کی تقسیم۔“ (3)

دو حوالے اور تھے جن کا ذکر ضروری ہے اور جس نے ہماری ادبی اور اجتماعی زندگی کو بے حد متاثر کیا یعنی اوّل یہ کہ ”دیس“ غلام تھا، اور اسی حوالے سے آزادی کا خواب اور اس کے لئے ہر سطح اور ہر جہت کی جدوجہد ہر تخلیقی فنکار کی آرزو

اور اثاثہ، دوم یہ حقیقت کہ برصغیر میں جو سیاسی و معاشی ماحول ترتیب پا رہا تھا اس میں مسلم کمیونٹی کی حفظ و بقا کا اہتمام کس طور ہو پائے گا؟ اور برصغیر میں سب سے بڑے سیاسی اور اساسی مسئلے یعنی قومیت کے تصور کے بارے میں الجھن اور اس کا حل۔ شعوری طور پر ہر لکھنے والے کو یہ امور متاثر کر رہے تھے، ادبی سطح نظر میں وقوع پذیر ہونے والے تغیر اور ارتقاء پر یہ اجتماعی مسئلہ اپنا اثر ڈال رہے تھے۔

تو یہ وہ دور ہے جب نوجوان رشید اختر ندوی کے مشاہدات مربوط و منظم کہانیوں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ یہ دور ناول کی صنف کے لئے نہایت موزوں دور رہا۔ اُردو ادب کا مزاج جیسا کہ باور کیا جاتا رہا ہے، عمومی طور پر ”غزل“ کا مزاج ہے جو معروضیت، جو تفصیل اور جو توقف ناول پڑھنے کے لئے چاہیے وہ یہاں کہاں۔ جو تجربہ غزل کے پانچ سات شعر بیان کرتے ہیں وہ دو چار سو صفحات پر پھیلے قصے میں کون پڑھے۔ طبعاً شاید جہان سے سرسری گزرنے والا رجحان غالب رہا اور اس طرف توجہ کم گئی کہ، جہان دیگر کے امکانات بھی موجود ہیں۔

”ناول یا طویل کہانی کو پڑھنے کے لئے جو طبیعت، جو مزاج، جو ٹھہراؤ درکار ہوتا ہے وہ یہاں مفقود تھا شاید اب بھی ہے۔ طبیعت تفصیل پسند نہیں، کون کہانی کے مکمل ہونے کا انتظار کرے، پلاٹ، کردار، اندرونی نظم اور تسلسل، زمان و مکان کے جھیلوں کو کون ایک وحدت یا اکائی کی صورت سمجھنے کی کوشش کرے۔ کچھ اسی قسم کی وجوہ ہوں گی کہ اُردو ناول اپنے بے پناہ امکانات کے باوجود اپنے دیوانے پیدا نہیں کر سکا۔ ناول کے ایسے دیوانے پورے سماجی ماحول اور اجتماعی ذہنی سطح میں ترقی اور تبدیلی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔“ (4)

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اواخر اور چوتھی دہائی اوائل میں کچھ یہی صورت حال تھی۔ ناول لکھا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے موضوعات تھے، یقینی طور پر پڑھنے والے بھی موجود تھے۔ اس نئی صنف ادب کے لئے فضا تیار ہو رہی تھی۔ اس دور کے ایک مضمون ”اُردو ناول“ میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں کہ:

”ناول کے پینے کے لئے کسی حد تک ہمارے سماجی ماحول کا بدلنا ضروری ہے۔ ناول پڑھنے کے لئے اور ناول لکھنے کے لئے کافی فرصت چاہیے، یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والوں کا ایک معقول طبقہ ایسا ہو جو ناولوں کی ورق گردانی میں وقت صرف کر سکے اور لکھنے والوں کے پاس ایسی فرصت ہو کہ وہ اطمینان سے اپنا کام پورا کر سکیں۔ آج کل یہ دونوں باتیں بہت حد تک مفقود ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے لکھنے والے اپنی ذاتی الجھنوں اور ذہنی گھٹن سے چھٹ کر زیادہ وسیع انظری سے زیادہ کھل کر اپنے آس پاس کی دنیا کا مشاہدہ کریں، ان کے سماجی احساس اور شعور میں زیادہ وسعت اور بلندی پیدا ہو اور اس احساس کی افراکش کے لئے سماج اور جمہور کے اجتماعی شعور کو آگے بڑھانا بھی لازم آتا ہے۔“ (5)

فیض اساسی طور پر ایک شاعر تھے، نثر اور ناول نگار سے ان کی توقعات کتابی اور علمی طور پر درست تھیں لیکن دیگر اصناف ادب کی طرح ناول بھی اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے اور اس کے لئے تخلیق کار موافق یا مخالف ماحول اور فضا سے متاثر تو شاید ہوتا ہو، منع نہیں ہوتا، یعنی اپنے اظہار کے سلیقے اور وسیلے سے دست کش نہیں ہوتا۔ جو فنکار طبعاً ناول نگار ہے وہ

اپنا اظہار ناول میں ہی کرے گا کہ یہ صنف اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوگی۔ نوجوان رشید اختر ندوی نے میٹرک کے بعد سے لے کر گریجویٹیشن تک گھر سے دور رہ کر تعلیم حاصل کی۔ جامعہ ملیہ کا فارغ التحصیل سرکاری نوکری کی بجائے صحافت کا آزاد پیشہ اختیار کرتا ہے اور پھر چند ہی سالوں میں اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ طبعاً ناول کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا سکتا ہے۔ اب زندگی رشید اختر ندوی کے سامنے چھوٹی بڑی کہانیوں کی صورت میں دا ہو رہی تھی۔ ایسے میں ناول کو ذریعہ اظہار بنانا، نوجوان رشید اختر ندوی کے عزم و اعتماد کا برملا اظہار ہے۔

اس دور میں معاشرتی رومان اور معاشرتی یک رنگی و یکجہتی رشید اختر ندوی کے مثالیے تھے۔ اس دور کے نمایاں رجحانات اور مقبول رومانی موضوعات ہمیں رشید اختر ندوی کے ناولوں میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ اس دور میں یعنی 1941ء سے لے کر 1951ء تک دس برسوں میں انہوں نے سولہ رومانی اور نفسیاتی ناول لکھے۔

ان جملہ ناولوں میں رشید اختر ندوی کی تخلیقی زندگی کے ایک رخ اور خود رشید اختر ندوی کے مزاج سے ہم آہنگ رخ کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ ہاں مگر ایک الجھن ساتھ ساتھ چلتی اور پلتی رہی۔ رشید اختر ندوی کی تعلیم و تربیت اور ذہنی ساخت کی ترتیب و تہذیب میں ان کی والدہ محترمہ سیدہ غلام فاطمہ کا نہایت گہرا اثر رہا۔ آلو مہار شریف کی پیری مریدی اور سجادہ نشینی کے ماحول سے نکال کر دہلی اور ندوۃ میں تعلیم کے لئے بھیجنا، تنہا ان کی والدہ سیدہ غلام فاطمہ کا فیصلہ تھا تو ساتھ ہی ان کی کچھ توقعات بھی اس نوجوان سے ضرورتیں۔ رشید اختر ندوی کی والدہ محترمہ مولویت سے بے زارتیں لہذا ندوۃ نے رشید اختر کو ندوی تو بنادیا لیکن مولوی نہ بناسکا، بلکہ وہ وصف جس کی طرف عبد المجید سالک نے اشارہ بھی کیا ہے کہ ”مصنف ندوۃ العلما کا مولوی ہی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے“ (6) ہمیشہ رشید اختر ندوی کے ناولوں میں نمایاں رہا ہے۔ یہاں جس الجھن کی طرف اشارہ مقصود ہے یعنی والدہ کی طرف سے اس طرح کی ناول نویسی کی سخت مخالفت تو والدہ کی اس ناپسندیدگی اور مخالفت کے باوجود رشید اختر ندوی کو اپنی یہ حیثیت عزیز رہی۔ رشید اختر ندوی کی والدہ محترمہ تو اتر سے کہتی رہتی تھیں کہ جھوٹی کہانیاں لکھنا بند کر دو۔ (7)

لیکن رشید اختر ندوی ناول نگاری کے اُس دور کا حصہ بنے رہے۔ وہ والدہ سے مسلسل وعدہ کرتے رہتے کہ بس چھوڑنے ہی والے ہیں لیکن اپنا کام بھی کرتے جاتے۔ اس کیفیت میں وہی کچھ ہوا جو فیض احمد فیض نے مولوی نذیر احمد کی ناول نگاری کے بارے لکھا ہے یعنی یہ کہ:

”ان ناولوں میں مولوی اور آرٹسٹ کی مسلسل ہاتھ پائی ہوتی رہتی ہے اور آرٹسٹ عام طور پر جیت جاتا ہے۔“ (8)

کچھ اسی طرح رشید اختر ندوی کے اس دور کے ناولوں کے بارے میں عمومی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان ناولوں میں ندوۃ کا مولوی جامعہ ملیہ کا گریجویٹ اور ایک آزاد منش فنکار آپس میں ہاتھ پائی کرتے رہتے ہیں اور جیسا کہ ان ناولوں میں جانبا نظر آتا ہے کہ آزاد منش فنکار ہمیشہ جیت جاتا ہے۔

سازِ شکست، رشید اختر ندوی کا پہلا رومانی ناول ہے۔ یہ ناول 1941ء میں مکمل ہوا۔ نوجوان رشید اختر ندوی نے ناول اور مصنف کو متعارف کرانے کے لئے ناول کا مسودہ عبد المجید سالک کی خدمت میں پیش کیا، قدرے توقف کے بعد عبد المجید سالک نے اس ناول کا تعارف لکھنے پر آمادگی ظاہر کی۔ 13 اگست 1941ء کو عبد المجید سالک نے اس کا تعارف

مکمل کیا اور یوں یہ ناول 1942ء میں دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس دور میں اس ناول کی قبولیت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ناول کی پہلی اشاعت (1942ء) کے بعد آنے والے آٹھ برسوں میں یعنی 1954ء تک یہ ناول آٹھ بار مزید شائع ہوا۔ اس سے یہ اندازہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں رومانی ناول نگاری کس قدر مقبول تھی اور پڑھے لکھے طبقے میں اس مضمون کے ناول پڑھنے کا کس قدر رجحان موجود تھا۔ گریجویٹیشن کرنے کے بعد سات سال تک رشید اختر ندوی قلم ہاتھ میں پکڑ کر جدوجہد کرتے رہے۔ میدان صحافت تھا، اس دوران انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔

سازِ شکستہ، اٹھائیس سالہ رشید اختر ندوی کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے کا کلید معلوم ہوتا ہے۔ یہ رشید اختر ندوی کا محرکہ آراء ناول نہیں ہے لیکن عالمِ شباب میں خود مصنف نے جو عذاب اٹھائے ہوں گے جو خواب دیکھے ہوں گے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جو رنگ سامنے آئے ہوں گے ان سب کی جھلک اس مختصر ناول میں مل جاتی ہے۔ یہ ناول فکشن کی دنیا میں مصنف کا پہلا قدم ضرور ہے لیکن شخصی المیے سے لے کر اجتماعی اداسی تک سب ایک وحدت میں دکھانے کی کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی ہے۔

اس ناول میں رشید اختر ندوی ”دے بفرو ختم جانے خریدم“ کی منزل تک تو نہیں پہنچے لیکن ”تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے“ کا احساس پورے ناول میں جا بجا نظر آ جاتا ہے۔ اسے حسن اتفاق ہی کیسے کہ جس سال ”سازِ شکستہ“ منظرِ عام پر آیا اسی سال فیض احمد فیض کا پہلا مجموعہ کلام ”نقشِ فریادی“ شائع ہوتا ہے۔ فیض اور رشید اختر ندوی قریباً ہم عمر تھے۔ رشید اختر ندوی ایک آدھ برس چھوٹے ہوں گے۔ ایک شاعر ہے، ایک نثر نگار، دونوں سیالکوٹ کی مٹی سے اُٹھے ہیں۔ دونوں برصغیر میں بیسویں صدی کے اوائل کے آشوب سے واقف و آگاہ ہیں اور سب کچھ بدلنے کی آرزو اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ شعر کی تاثیر نثر سے زیادہ ہوتی ہے، لہذا فیض احمد فیض کی صدا جلد مقبول و معروف ہو گئی اور اپنے عہد کی نمائندہ خیال کی جانے لگی۔ نثر کے لئے اور خاص طور پر ناول کو پڑھنے سمجھنے اور اثر پذیر ہونے کے لئے جس ذہنی تربیت اور رجحان طبع کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُردو دنیا میں فراوان نہیں رہا۔ پھر بھی ناول نے اپنی ایک جگہ بنائی اور کہانی کے امکانات کو دریافت کرنے کا ایک وسیع میدان ثابت ہوا۔ فیض احمد فیض اور رشید اختر ندوی کا عہد ہی یکساں نہیں، دونوں کو درپیش مسائل و مصائب بھی ملتے جلتے ہیں، لہذا دونوں کے خواب و خیال بھی اپنے عہد کے حوالے سے ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں یعنی ایک بہتر زندگی کی آرزو۔ ”سازِ شکستہ“ کی طرف اگر ”نقشِ فریادی“ کے حوالے سے نظر اٹھائیں تو وہ نقشِ فریادی کے حصہ اول کی منظومات و غزلیات کا نثری اظہار معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ناول نگار کو مزید آگے بڑھنا ہے لیکن ایک بات نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب میں جن تغیرات اور رجحانات کی طرح ڈالی تھی انہوں نے ناول نگار رشید اختر ندوی کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ 1936ء میں اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا پُر زور آغاز ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ:

”ترقی پسند تحریک، ادب میں جس کا باضابطہ آغاز 1936ء میں ہوا، بنیادی طور پر ایک باغیانہ تحریک تھی۔ یہ بغاوت ذہنی رویوں اور فکری جہتوں میں جتنی نمایاں تھی، اتنی ادب میں نہیں تھی۔

”انگارے“ کی کہانیوں سے قطع نظر (کہ وہ ایک تجرباتی دھماکہ تھا) شعر و ادب میں اس تحریک کے نمائندہ، فنکاروں نے ادبی روایت سے رشتہ قائم رکھا۔ ادبی تحریک کے غالب رجحانات پر نظر رکھی۔ تخلیقی میدان میں نئے تجربات کی ترغیب کو حد اعتدال میں رکھنے کی کوشش کی..... انیسویں صدی کے آخری چار دہوں میں نثر ہو یا نظم اپنی اصناف، اپنے اسالیب، اظہار اور نئے فارم ہی نہیں، نئے موضوعات بھی متعارف ہوئے۔ اس لئے کہ نوآبادیاتی طرزِ حیات میں معاشرتی اور تعلیمی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے زیر اثر نئے زاویہ ہائے نظر بھی پیدا ہو رہے تھے۔ اس زمانہ کے اہل نظر اور اہل قلم کے فکر و احساس میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت داخل ہو رہی تھی۔ دلوں میں ملک و قوم کی محکومی اور خستہ حالی کا درد جگہ بنا رہا تھا۔ وہ اپنے عہد کی تبدیلیوں کو ایک اجتماعی اور تنقیدی زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔“ (9)

دہلی میں صحافت کرنے والے رشید اختر ندوی قلم و قراطس کی دنیا کے ان رجحانات سے نہ صرف واقف و آگاہ تھے بلکہ حد درجہ متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ رشید اختر ندوی کی شہرت معروف و مخصوص معنوں میں ایک ترقی پسند مصنف کی نہیں ہے لیکن 1941ء سے 1951ء تک کے دس برس انہوں نے جو ناول تخلیق کئے ان میں ترقی پسند ادب کے جملہ عناصر بہ تمام و کمال نظر آ جاتے ہیں۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں ”دراصل ہر وہ ادیب جو سامراج دشمنی اور جمہوری اقدار پر یقین رکھتا ہو وہ ترقی پسند کہلائے گا۔“ (10) رشید اختر ندوی کے پہلے ناول کا ہیرو سلیم اپنی تمام تر روشن خیالی، قربانی اور خلوص کے باوجود طبقاتی بُعْد کا شکار ہوتا ہے۔ اس ناول کے ہیرو کی زندگی خود مصنف کی زندگی سے علامتی طور پر سہی، حد درجہ متصل نظر آتی ہے۔ رشید اختر ندوی کی رومانی ناول نگاری کا سب سے نمایاں نشان ان کا ناول ”تفنگی“ ہے۔ ”تفنگی“ متعدد وجوہ کی بناء پر رشید اختر ندوی کا ایک اہم اور نمائندہ ناول شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناول رشید اختر ندوی کی رومانی ناول نگاری کا عمدہ شاہکار ہے۔ بیسویں صدی میں چالیس کی دہائی رشید اختر ندوی کی رومانی معاشرتی ناول نگاری کا سنہری زمانہ ہے۔ اس دور میں مجموعی طور پر زیادہ ناول لکھے گئے، اس ناول میں رشید اختر ندوی کا رومان اور آدرش کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ وہ ایک مخلوط معاشرت کا فرد ہے اس کے خواب اور اس کے مثالیے بڑے واضح اور قابل فہم نظر آتے ہیں۔ اظہار ذات کی مسرت سے لبریز یہ ناول رشید اختر ندوی کو ہمیشہ عزیز رہا۔ رشید اختر ندوی پر ایک طرف ترقی پسند ادب کے رجحانات اثر انداز ہو رہے تھے، تو دوسری طرف وہ طبعاً اشتراکیت میں اپنی دلچسپی چھپا نہ پاتے تھے۔ یہ دلچسپی اس نظم اور تربیت سے متصادم تھی جو رشید اختر ندوی نے ندوۃ اور جامعہ میں حاصل کی لیکن ناول کے ہیرو کے لئے اس طرح کے نظریات کے لئے جدوجہد کرنا اور اس طرح سے کرنا کہ کہانی کے جملہ امکانات اس کا ساتھ دیتے رہیں کافی سہل تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس دور میں رشید اختر ندوی کی وسیع المشربی عروج پر تھی اور وہ خیال کرتے تھے کہ برصغیر کی جملہ اقوام باہم اتفاق و اتحاد کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہیں۔ اس رومان کا اظہار ناول کا ہیرو اپنے قول اور عمل سے کرتا ہے۔ یہ ایک بڑا خواب ہے۔ اس وقت غلام ہندوستان میں آنکھیں کم تھیں اور خواب زیادہ۔ (11) اور انہی خوابوں کے فنکارانہ اظہار کے ذریعے ایک تخلیقی فنکار اپنے مخاطب کو اپنا ہمنوا بنانے کی سعی کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ امر ذہن میں رہے کہ ناول کا عنوان ”تفنگی“ ہے اور اس ایک عنوان میں مصنف کے رومان اور آدرش کے حوالے سے ایک جہان معنی آباد ہے۔ ”تفنگی“ کے دیباچے میں رشید اختر ندوی

لکھتے ہیں کہ:

”یہ ناول اس آوارہ خرام اور آوارہ مزاج مصنف نے بمبئی میں بیٹھ کر لکھا اور اس وقت لکھا جب وہ سماج و مذہب کے ہر بندھن سے خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ جب وہ صرف ایک مذہب پر ایمان رکھتا تھا اور وہ مذہب انسانیت اور شرافت کا مذہب تھا۔ جب اس کے نزدیک آدمی ہندو تھا نہ مسلمان۔ آدمی محض آدم کا بیٹا تھا۔ اس آدم کا بیٹا جو جب جنتوں سے اس زمین پر پھینکا گیا تو محض خدا کا نائب تھا اور کچھ نہ تھا۔ اس نے لباس پہنے، پیٹ بھرنے اور زندگی کے رشتوں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کا ہنر یہیں سیکھا۔“ (12)

اسی دیباچے میں مصنف مزید وضاحت کرتا ہے:

”یہ ناول اس وقت کی تصنیف ہے جب ہندوستان غلام تھا اور انگریزوں کے ظالم و جابر پنجے نے ہندوستانیوں کے گلے گھونٹ رکھے تھے، اس وقت میری بے چین روح ایک ایسے سماج اور ایک ایسے نظام کے لئے تڑپتی جس میں آدمی نہ ہندو ہوتا نہ مسلمان، نہ پارسی ہوتا نہ عیسائی۔“ (13)

رشید اختر ندوی کا مذکورہ بالا نصب العین ادب اور زندگی کے جدید اور ترقی پسند تعلق کی یاد دہانی کراتا نظر آتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری ”ادب اور زندگی“ کے زیر عنوان اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

”ہر ایماندار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے، اسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چوہوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔“ (14)

رشید اختر ندوی نے ”تفنگی“ میں ایک ایماندار اور صادق ادیب کی طرح اسی نصب العین کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا بیانیہ بلند آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”تفنگی“ بطور رومان اور بطور نصب العین رشید اختر ندوی کو ہمیشہ نہایت عزیز رہا۔ اس ناول کا آئیڈیل اس دور کے دانش ور طبقے کا مقبول خواب و خیال ہے۔ ہر طرح کے نفاق اور فرق و امتیاز سے پاک معاشرے کا خواب رشید اختر ندوی کی عزیز ترین متاعِ شہر کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ مذہبی طور پر رشید اختر ندوی ایک مسلمان تھے لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ سمجھتے تھے کہ کسی بھی معاشرتی ترتیب میں مذہب کو وجہ نزاع نہیں بننا چاہیے۔ رشید اختر ندوی کی وہ جملہ تحقیقی و تاریخی مساعی، جو انہوں نے بہت بعد کے سالوں میں کی، اسی تاثر پر بنیاد کرتی ہے۔ تاہم اس ناول میں رشید اختر ندوی کا لہجہ خاصا بلند آہنگ ہے۔ اپنے اس ناول کے جملہ کرداروں کے بارے میں یہ بیان کہ:

”سب کا مذہب ننگے آدم کا مذہب تھا۔ سب کے نام گو مختلف تھے مگر سب کا عقیدہ ایک تھا۔ آدمی صرف آدمی رہے اور آدمی رہ کر ہی اپنا منصب پہچانے۔ اگر ”تفنگی“ کے پڑھنے والے ان ”آدمیوں“ کی تشہ روحوں کو سمجھ لیں جو اس ناول کے اندر بھاگتے پھرتے اور سوچتے ہیں تو رشید اختر ندوی، اس کا تشہ روح مصنف بڑا سکون پائے گا۔“ (15)

اس المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس ناول کے تشنہ روح مصنف نے تخلیق کیا۔ اس المیے کی اساس یہ ہے کہ آدمی آدمی رہ کر اپنا منصب پہچاننے پر آمادہ نہیں ہوا وہ اس ناول کو مکرر پڑھنے، اس کے کرداروں کے ساتھ وقت گزارنے اور مال جاننے کے بعد اس تشنگی کی صحیح تفہیم میسر آتی ہے، جس کی طرف فاضل ناول نگار بہ اصرار اشارہ کر رہا ہے۔ ناول کا پورا ڈھانچہ اس کے مثالی ہیرو محسن کے گرد گھومتا ہے۔ محسن کے حوالے سے ناول نگار ہمیں اس عہد کے بین الاقوامی سیاسی تناظر سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ ناول کا ہیرو اسٹالن کے سوویت روس اور وہاں کے سیاسی و معاشرتی نظام کو برصغیر کے ہمہ جہت مسائل کا حل تصور کرتا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے فیصلے کرتے ہوئے اور عمل کرتے ہوئے اپنے مذہب کو حوالہ نہیں بناتا۔ وہ صرف 'انسانیت اور شرافت' کے مذہب کو مانتا ہے۔ کتابی طور پر یہ نہایت دلچسپ باتیں ہیں لیکن ناول کے ہیرو کے نہایت الم ناک انجام نے ایک ایسے سماج کے لئے تڑپنے والی روح کی تشنگی کو آشکارہ کر دیا جس میں بقول مصنف ”آدمی ہندو ہوتا نہ مسلمان نہ پارسی ہوتا نہ عیسائی۔“ (16)

رشید اختر ندوی کی رومانی ناول نویسی کے جملہ عناصر تشنگی کا حصہ ہیں۔ سہیل بخاری نے 'سازِ شکستہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”پلاٹ کا یہ مخصوص ڈھانچہ اور اس مصنف کا اصرار یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پس منظر میں ان کا

کوئی ذاتی تجربہ ضرور موجود ہے۔“ (17)

تشنگی کے حوالے سے اس تبصرے میں یہ اضافہ کہا جاسکتا ہے کہ اس ناول کے پلاٹ، کردار اور پس منظر و پیش منظر میں مصنف کی ذاتی خواہشات اور رجحانات ضرور موجود ہیں۔ رشید اختر ندوی معاشرے میں تبدیلی، شعور اور فہم و فراست کو عام کرنے کے لئے جو جدوجہد کرتے ہیں وہ قلم کے ذریعے کرتے ہیں، لیکن ان کے کردار کا عمیق مطالعہ اور تجربہ یہ باور کراتا ہے کہ وہ عملی جدوجہد کی ایک آرزو ضرور پرورش کرتے رہے، وہ قلم کے میدان کے شہسوار تھے لیکن اپنی دانست میں وہ ایک ایسے رشید اختر ندوی سے بھی واقف ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں جو کالج کا سب سے مقبول و محبوب طالب علم ہے جو سیاسی جدوجہد کرتا اور اس کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاتا ہے۔ وہ جیل سے فرار ہو کر مشرقی بنگال سے برما اور برما سے ماسکو پہنچ جاتا ہے۔ اسی رشید اختر ندوی کو جیسا کہ ان کے رومانی ناول پڑھنے والے سمجھ سکتے ہیں، جمیل عورتیں بے حد پسند ہیں اور ان کے ناولوں کا قاری یہ بات بھی جانتا اور سمجھتا ہے کہ ہیرو کے آس پاس موجود ہر لڑکی اسے چاہنے لگتی ہے۔ یہ فضا صرف تشنگی کا حصہ نہیں بلا امتیاز ہر ناول میں یہی واردات دہرائی جاتی ہے۔ صنف نازک سے دوطرفہ التفات کی فراوانی، خواتین کی سراپا نگاری میں حد درجہ بے باکی اور اگر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کی اخلاقی سطح کو ذہن میں رکھ کر بات کی جائے تو کانوں کی لوسرخ کر دینے والی بے باکی، ایک عام بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مقامات پر مصنف خود پر اور اپنے قلم پر قابو کھو بیٹھتا ہے۔ تشنگی کا ہیرو ایک مثالی کردار ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ ناول مولوی نذیر احمد نے نہیں لکھا، ورنہ یہ مثالی کردار زیادہ تکلیف دیتا۔ ناول کے سینتیس (۳۷) ابواب محسن کی کردار نگاری کے لئے وقف ہیں۔ محسن کالج کا ہونہار، لائق اور مقبول طالب علم ہے۔ فصیح انگریزی بولتا ہے، شاعر بھی ہے، خطیب بھی ہے، اور کالج کی جملہ طالبات کی نگاہوں کا مرکز اویں بھی۔

بی اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ مکمل کرنے کے بعد کالج کے پرنسپل سے ایک جلسہ عام میں چار تمنے وصول کرنے

والا حسن اب ایم اے فلسفہ کرنا چاہتا ہے۔ موصوف ناول کے پہلے ہی باب میں بی اے میں داخلہ حاصل کرنے والی ایک انگریز لڑکی مس میری کی محبت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ مشرقی اقدار کا پاسدار یہ فلسفی شاعر اور نوجوان خطیب مس میری کا ذکر کرتے ہوئے بے قابو نظر آتا ہے۔ مس میری انگریز لڑکی ہے۔ صرف یہی نہیں، محسن مس میری کے ساتھ وقت گزارتا، باتیں کرتا، شالیمار باغ کی سیر کرتا، ہاتھ پکڑ کر چلتا اور ایک دوسرے کے قریب آکر مس میری کی نیلی نیلی گہری گہری آنکھوں کو دیکھتا رہتا۔ رشید اختر ندوی کے عمومی ہیرو کی طرح محسن بھی عملی طور پر ایک بزدل، خائف اور شرمیلا عاشق ہے۔ دوسری طرف مس میری صرف محسن کے لئے اُردو سیکھنا شروع کر چکی ہے۔ ہمارا ہیرو ایک انگریز لڑکی کی محبت میں گم ہے کہ غلام ہندوستان ایک کروٹ لے کر بیدار ہوتا ہے۔

”ملک بھر میں بیداری پھیلتی جا رہی تھی اور ہندوستان کے لوگ سمجھ ہی نہیں، سوچ ہی نہیں بلکہ عمل سے یہ ثابت کرنے لگے تھے کہ وہ کسی دوسری قوم کے غلام نہیں رہ سکتے۔ کوئی باہر سے آئی ہوئی قوم ان پر جبراً حکومت نہیں کر سکتی۔ اب وہ آزاد ہونا چاہتے تھے اور آزادی کی تحریک ملک کے گوشے گوشے اور کونے کونے میں عام ہو گئی تھی۔ آزاد ہندوستان کی تعمیر کرنے والے جوان مرد ہندوستانی آزادی کا علم ہاتھ میں لے کر قریب قریب شہر بہ شہر پھر رہے تھے۔“ (18)

یہ بے چینی اس تیزی سے بڑھی کہ ہندو، سکھ، عیسائی سب تڑپ اٹھے، خلافت اسلامیہ کے مرکز ترکی پر حملے کے سبب مسلمانوں میں سب سے زیادہ اضطراب تھا، پھر ہڑتالیں، مظاہرے، گرفتاریاں، کہیں مارشل لائی، کہیں گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ چونکہ محسن بقول مصنف:

”..... بڑا فلسفی ہی نہ تھا وہ صرف شاعر ہی نہ تھا فرض شناس ہندوستانی نوجوان تھا۔ اسے غلامی کی برائیاں اور آزادی کی اچھائیاں معلوم تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ غلام قوم انسانیت کی پیشانی پر سب سے مکروہ داغ ہے۔“ (19)

محسن ہڑتال میں تقریریں کرتا کرتا گرفتار ہو کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ مس میری نے اسے جیل سے رہا کرانے کی اپنی سی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ محسن کو سات سال کی قید سنا دی گئی جبکہ مس میری کو اس کے باپ نے واپس انگلستان بھجوا دیا۔ محسن ہوتے ہوتے کلکتہ جیل پہنچ گیا، وہ سیاسی قیدی تھا۔ وہیں اسے مس میری کی وفات کی خبر ملی۔ ناول نگار کے لئے انگلستان میں مس میری کو بلاوجہ زندہ رکھنا مشکل تھا اور پھر آنے والے صفحات میں مزید خوبولڑکیاں محسن سے دل لگانے کی منتظر تھیں لہذا مس میری کا باب بند کر دیا گیا۔

محسن کلکتہ جیل سے فرار ہو کر مشرقی بنگال کے راستے رنگون جیسے رنگین شہر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں سے مصنف کا قلم رواں ہوتا ہے اور منورما نامی ایک ہندو دوشیزہ کے ساتھ محسن کا رومان شروع ہوتا ہے۔ سفید ریشم کی ساڑھی میں لپٹی منورما کے ساتھ محسن نے متصل ہو کر اور ہاتھ تھام کر کانپنے میں ذرا دیر نہیں کی۔ وہ اب ایک بدلا ہوا عاشق معلوم ہوتا ہے، وہ بغیر کسی تاخیر کے منورما سے اظہار محبت کرتا ہے ساتھ ہی احتیاطاً یہ بھی پوچھ لیتا ہے کہ تم ہندو ہو اور میں مسلمان۔ تمہارے اور میرے درمیان مذہب کی خلیج حائل ہے، یہاں منورما اپنا موقف بڑے واضح انداز میں بیان کرتی ہے کہ:

”جی ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہے مگر میرے ہندو اور آپ کے مسلمان ہونے کے باوجود ہم

دونوں میں محبت ہو سکتی ہے اور محبت تو دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ محبت کو تو مذہب سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی لگاؤ۔ اور میری محبت تو کسی رکاوٹ کو تسلیم نہیں کرتی۔“ (20)

منورما کے ساتھ آبشار کے کنارے سیر کرنے کے بعد حالات کروٹ لیتے ہیں اور منورما کی شادی کہیں اور طے کر دی جاتی ہے۔ منورما یہ سوچتے ہوئے بادل خواستہ شادی کی تیاریوں میں لگ جاتی ہے کہ

”کیا جوان لڑکیوں کے دلوں میں اپنی پرستش کا جذبہ پیدا کر کے بھاگ جانا کوئی شرافت ہے؟“ (21)

دوسری طرف ضمیر کے عذاب میں مبتلا محسن ایک سال متواتر ملک ملک دھکے کھانے کے بعد بالآخر روس میں پناہ گزین ہو چکا تھا اور وہ ماسکو کے ایک ہوٹل میں بیٹھا بچھے ہوئے دل اور بے چین روح کے ساتھ اپنے ماضی پر نظر دوڑا رہا تھا۔ یہاں محسن اپنی سیاسی جدوجہد اور اس کی مشکلات کی بجائے اپنی زندگی میں آنے والی عورتوں کے بارے میں تجزیہ کر رہا تھا۔ ”وہ سوچ رہا تھا اس نے دو بار محبت کی، دو بار سچے دل سے دو عورتوں کو چاہا، یہ دونوں معصوم تھیں اور دونوں اس سے محبت کرتی تھیں۔ لیکن یہ دونوں اس سے چھین لی گئیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کسی سے محبت نہیں کرے گا، کسی کو اپنی بے چین روح کا شریک نہیں بنائے گا، متواتر چھ مہینے سے وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ میری سے محبت کی، اس کا انجام کیا ہوا اور اس انجام کے ہوتے ہوئے اس نے منورما سے قسمت آزمائی کیوں کی۔ وہ تو بد نصیب تھا، اسے تو اپنی بد نصیبیاں معلوم تھیں۔ پھر نئے تجربہ سے اس نے اپنے ساتھ ایک نئی زندگی کو آلودہ کرنا کیوں ضروری سمجھا؟“ (22) غور و فکر کے یہ وہ موضوعات ہیں جن کی روشنی میں محسن اپنے ماضی کا تجزیہ، حال کی ترتیب اور مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ بد نصیبی اس کی شخصیت کی کلید معلوم ہوتی ہے اور اسی کلید سے وہ خود کو تسلی بھی دیتا ہے اور طاقت بھی۔ اپنے ساتھ ہونے والی ہر واردات کی وجہ محسن محض بد نصیبی کو خیال کرتا ہے اگرچہ محسن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی کو اپنی بے چین روح کا شریک نہیں بنائے گا لیکن عین اسی وقت اس کے دروازے پر دستک ہوتی ہے، وہ دروازہ کھولتا ہے اور سامنے مس زورا زركوف ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔ ناول نگار بتاتے ہیں مس زورا زركوف وہ پہلی خاتون تھیں جس سے محسن کو ماسکو کے دوران قیام قریب ہونے کا موقع ملا۔ مس زورا زركوف وزارت خارجہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھیں اور اس محکمہ کی انچارج جو بیرونی ممالک کے لئے بالشوزم کا لٹرچر تیار کرتا، وہ بڑی ذہین، بڑی طباع اور انتہائی عالم خاتون تھی۔“ (23)

اب محسن کا قیام روس اور وہاں کی جدوجہد شروع ہوتی ہے۔ زورا زركوف کی مدد سے وہ زورا کے محکمے میں اسسٹنٹ جرنلسٹ بنادیا جاتا ہے اور کام اس کا اُردو زبان میں بالشوزم کا لٹرچر تیار کرنا قرار پاتا ہے۔ یہ ٹرائسکی کے زوال کے بعد کا وہ روس ہے جس میں اسٹالن سارے نظام پر چھا گیا تھا۔ لینن کے ساتھ ٹرائسکی کی جدوجہد اور اشتراکی معاشرے اور حکومت کی تشکیل کے لئے اس کی مساعی اور زوال، یہ محسن اور زورا زركوف کے مشترکہ مباحث تھے لیکن یہاں ناول نگار نے اسٹالن کے عہد کے اشتراکی روس کی تعریف و توصیف کے لئے یقینی طور پر ہندوستان میں دستیاب لٹرچر پر انحصار کیا ہوگا۔ اشتراکیت سے ناول نگار کی دلچسپی اور روس کے نظم ریاست کی محبوبیت محض کتابی معلوم ہوتی ہیں۔ روس کی سیاست ہمہ گیر سیاست ہے۔ وہ کسی ایک ملک کی نہیں، ساری کائنات کی سیاست ہے اور وہ نظام جسے لینن نے قائم کیا، ساری دنیا

میں رائج ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (24)

اس ناول کی تفنگی کی اساس یہ ہے کہ ہندوستان میں اشتراکیت کی شمع روشن کرنے کا خواب دیکھنے والا ایک ’بھیڑیے کی کھال پہن کر سوشلسٹ بننے والی چھوڑی‘ (25) کی بے وفائی سے آزرده ہو کر اس کے گھر سے بھاگتا ہوا نکلتا ہے اور گھر کے سامنے ایک موٹر سے ٹکرا کر جاں بحق ہو جاتا ہے۔

قیام روس کے دوران مس زوراکوف کی وساطت سے وہ روس کے مرد آہن اسٹالن سے بھی ملاقات کر لیتا ہے۔ اشتراکی معاشرے اور نظم حکومت کی خیر و برکات کا بہ چشم خود مشاہدہ کرتا ہے اور جیسا کہ محسن سے توقع کی جاسکتی تھی وہ مس زوراکوف میں چھپی جذباتی عورت کو دریافت کر کے اس قدر بیدار کر دیتا ہے اور وہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے اور یہ محسن کی زندگی میں آنے والی تیسری عورت ہے۔ یہ بھی محسن سے شادی کرنے ہی والی تھی کہ ایک حاسد کی گولی کا نشانہ بن گئی، محسن زخمی ہو کر بچ رہا۔ اور یوں یہاں بھی تفنگی اس کا مقدر ٹھہری۔ محسن روس میں تقریباً چھ سال تک مقیم رہا، تا آنکہ ہندوستان میں حکومت اور آزادی پسند لیڈروں میں ایک عارضی معاہدے کے تحت سارے سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ محسن واپس ہندوستان آ جاتا ہے، یہاں اسے اپنے زمیندار باپ کی طرف سے ایک بڑی جائیداد ترکہ میں ملتی ہے، محسن نے اس ساری جائیداد کو ”فرینڈز سوسائٹی“ کے نام پر وقف کر دیا اور دل جیت نامی سکھ لڑکی کو اس سارے نظم و نسق کا مہتمم بنادیا۔ اب محسن کثرت مئے نوشی کا شکار ایک مقبول شاعر تھا اگرچہ دل جیت بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی لیکن وہ راشدہ کا شیدائی تھا۔ دونوں اکٹھے وقت گزارتے، کہانی اپنے الم ناک انجام کی طرف بڑھتی ہے اور محسن بیمار ہو جاتا ہے۔ راشدہ اس سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ آنکھیں پھیرنے کی وجہ محض یہ کہ ”راشدہ کو اس دیوانے شاعر سے گھن آنے لگی جو اپنی دولت قوم کے غریب اور مفلس بچوں کو دے کر خود اس حالت کو پہنچ چکا ہے کہ اسے اچھے کپڑے بھی میسر نہیں۔“ (26)

جب وہ شادی کر رہی ہوتی ہے تو اسے ملنے کے لئے آنے والا محسن غم سے نڈھال واپس بھاگتا ہوا راشدہ کے گھر کے سامنے گاڑی کی ٹکر سے جاں بحق ہو جاتا ہے۔ رشید اختر ندوی کو اپنے اس ناول پر بڑا فخر تھا۔ ناول کے دیباچے کی یہ عبارت ان کے اسی تاثر کی غماز ہے:

”یہ تفنگی، جس کے پہلے حرف سے لے کر آخری حرف میری تنگی، بھوکی روح کا سچا ترجمان ہے،

مجھے اپنے سارے ناولوں میں سے زیادہ پیارا ہے۔ جب میں بمبئی میں تھا اور یہ ناول چھپ چکا

تھا تو میں ہر روز خواب دیکھتا کہ مجھے اس تصنیف پر نوبل پرائز ملا ہے۔“ (27)

فاضل ناول نگار اس تصنیف پر نوبل پرائز کی بجائے اگر لینن امن ایوارڈ پانے کا خواب، ہر روز دیکھتے تو قابل فہم بات تھی کہ اس ناول میں سوویت روس، لینن کے روس اور اسٹالن کے روس کی کھل کر توصیف کی گئی تھی لیکن ناول میں اشتراکی انقلاب کا خواب دیکھنے والی آنکھوں کا جو انجام ناول نگار نے رقم کیا ہے وہ الم ناک ہے اور اس الم ناک انجام کی وجہ کوئی سیاسی یا معاشرتی حادثہ نہیں محض ایک جذباتی حادثہ ہے یعنی محبوبہ کی بے وفائی۔ یہاں محبوبہ (راشدہ) اگر حب وطن اور زندگی کا استعارہ ہے تو بات دوسری ہے لیکن کار جہاں کے حد درجہ بے ثبات ہونے کے دکھ نے اس ناول کے ایسے کو نمایاں کر دیا۔ یہ ناول رشید اختر ندوی کو عزیز تو رہا لیکن برصغیر میں رقم ہونے والے اشتراکی ادب میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکا۔ اس کے باوجود اس ناول نے اپنے عصر کے ترقی پسندانہ رویوں، خوابوں اور ان کے انجام کی نشاندہی بڑے موثر انداز میں کی ہے

اور یہی خوبی اس ناول کی اہمیت کو برقرار رکھے گی۔

حوالہ جات

- 1- اُردو ناول نگاری، سہیل بخاری، ص 300
- 2- فیض از فیض، مشمولہ دست تہہ سنگ، نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض (لاہور: مکتبہ کاررواں)، ص 304
- 3- سجاد ظہیر، روشنائی (کراچی: مکتبہ دانیال، بار سوم 2005ء)، ص 140، 141
- 4- رشید اختر ندوی، رومان، تاریخ اور تحقیق، شاہد اقبال کامران، نورینہ تحریم بابر، مشمولہ مجلہ معیار 6، شمارہ جولائی دسمبر 2011ء،
- شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص 545۔
- 5- مضمون 'اُردو ناول'، میزان، فیض احمد فیض (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، 1978ء)، ص 212
- 6- تعارف از عبد المجید سالک، مشمولہ ساز شکستہ، ص 5
- 7- (رشید اختر ندوی کی دختر ڈاکٹر لیلیٰ سیف روایت کرتی ہیں کہ ان کی دادی کہتی تھیں کہ یہ (رشید اختر ندوی) جھوٹی کہانیاں لکھتا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ رشید اختر ندوی علم و تحقیق کی طرف توجہ کرے اور فرضی قصے لکھنے سے توبہ کر لے۔ انٹرویو، ڈاکٹر لیلیٰ سیف)
- 8- میزان، فیض احمد فیض (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، 1987ء)، ص 207
- 9- ترقی پسند ادب کے معمار، ترتیب و مقدمہ پروفیسر قمر رئیس (دہلی: نیا سفر پبلی کیشنز 2006ء)، ص 21
- 10- روشنائی، سجاد ظہیر (کراچی: مکتبہ دانیال، 2005ء)، ص 17-18
- 11- رشید اختر ندوی 'رومان' تاریخ اور تحقیق، شاہد اقبال کامران، نورینہ تحریم بابر مشمولہ مجلہ معیار ۶، شمارہ جولائی-دسمبر 2011ء، ص 545
- 12- تنقیدی، رشید اختر ندوی (لاہور: بیاض گروپ آف پبلی کیشنز، اکتوبر 2007ء)، ص 5
- 13- تنقیدی، رشید اختر ندوی۔ ص 6
- 14- اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور زندگی مشمولہ 'فکری و نظری مباحث: پون صدی کا قصہ، ترتیب و تدوین حمیرا اشفاق (لاہور: سانجھ، فروری 2012ء)، ص 27
- 15- تنقیدی، رشید اختر ندوی۔ ص 6
- 16- تنقیدی، رشید اختر ندوی۔ ص 6
- 17- سہیل بخاری، اُردو ناول نگاری، ص 201
- 18- تنقیدی، رشید اختر ندوی۔ ص 30

- 19- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 31
- 20- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 156
- 21- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 190
- 22- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 193
- 23- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 194
- 24- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 210
- 25- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 375
- 26- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 374
- 27- تشنگی، رشید اختر ندوی۔ ص 6